قرآن مجید کے ہندی تراجم

جناب مولانا محمد فاروق خاں

قرآن مجید کے ہندی ترجمے کی کوشش کوئی نئی کوشش نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ۸۸۳ء میں مہروک بن رائک ایک حکمران ہوا ہے۔ اس کے حدودِ سلطنت میں کشمیر سے لے کر پنجاب اور راجستھان تک کے علاقے شامل تھے۔ یہ وہ دور ہے جب سندھ پر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ راجہ کی خواہش پر سندھ کے حاکم عبداللہ بن عمر نے ایک ایسے عالم کو بھیجا جو ہندوستان کی زبانوں سے واقف تھا۔ وہ راجہ کے یہاں تین سال تک رہا۔ راجہ کی فرمائش پر اس نے قرآن مجید کا ترجمہ کرنا شروع کیا اور سورۂ یٰسٓ تک ترجمہ مکمل کر لیا۔ اس کا ذکر چوتھی صدی ہجری کے مشہور و معروف سیاح ابن شہریار نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے[1]۔

قرآن مجید کا ایک ہندی ترجمہ مغل بادشاہ اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ یہ ترجمہ مکمل ہے۔ اس ترجمے کی بعض خصوصیات کا ذکر ہم آگے کریں گے۔ اس ترجمے کو دیکھنے کا شرف مجھے خود حاصل ہوا ہے[2]۔ مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی نے غالباً اسی ترجمہ کا ذکر مولانا سید محمد علی سے فرمایا تھا۔ مولانا سید محمد علی نے لکھا ہے کہ ایک روز عصر کے وقت مجھے بلا کر ارشاد فرمایا:

"مولوی عبدالقادر صاحب کے ترجمے سے دو سو برس پیشتر بھاکا (ہندی) میں

---

[1] بزرگ ابن شہریار، کتاب عجائب الہند، تہران، ۱۹۶۶ء، ص ۳، ۴۔

[2] عرصہ ہوا یہ نسخہ مجھے ایک ایسے شخص نے دکھایا تھا جو پرانی اور نادر چیزوں کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتا تھا۔

نہایت عمدہ ترجمہ قرآن شریف کا ہوا ہے - ہم نے دیکھا ہے"۔[1]

مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی (متوفی ۱۸۹۶ء) نے بھی قرآن کی کچھ سورتوں اور کچھ حصوں کا ترجمہ ہندی میں کیا تھا جو پہلے گلشنِ ابراہیمی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا اور بے حد پسند کیا گیا۔ دارالاشاعت کاندھلہ (ضلع مظفر نگر) نے قریبی زمانے میں اس ترجمہ کو دوبارہ شائع کیا ہے۔ اس کا ایک نسخہ میرے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔

خواجہ حسن نظامی کا قرآن پاک کا کرایا ہوا ہندی ترجمہ بھی مشہور و معروف ہے۔ یہ ترجمہ مولانا غلام محمد صاحب (سابق پنڈت کیشورام شرما) اور کئی دوسرے ہندو اور مسلم ماہرین ہندی کی مدد سے تیار ہوا تھا۔ یہ ترجمہ دو جلدوں میں شائع ہوا تھا۔ پہلی جلد ۱۹۲۸ء میں اور دوسری ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی۔

قرآن مجید کا ایک ہندی ترجمہ مولانا احمد بشیر فرنگی محلی اور غلام محمد قریشی نے بھی کیا تھا جو بغیر متن کے شائع ہوا تھا۔ دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ ۱۹۴۷ء کے بعد شائع ہوا ہے۔

شیخ محمد یوسف قادیان (ضلع گورداس پور) نے بھی قرآن مجید کا ایک ہندی ترجمہ کیا تھا۔ غالباً اس کی اشاعت ۱۹۱۹ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان ہوئی تھی۔ پادری ڈاکٹر احمد شاہ مسیحی نے القرآن کے نام سے قرآن کا ہندی ترجمہ ۱۹۱۵ء میں راجپورہ ضلع دہرہ دون سے شائع کیا تھا۔ یہ ترجمہ بغیر متن کے چھپا تھا۔ اس کے تین ایڈیشن نکلے۔ پہلا ایڈیشن پرتاپ پریس کان پور سے شائع ہوا تھا۔ آخری ایڈیشن ۱۹۳۵ء میں نکلا۔ یہ ترجمہ عربی سے براہِ راست کیا گیا ہے۔ ترجمہ کے ساتھ مختصر حواشی اور بائبل کے حوالہ جات بھی دیئے گئے ہیں۔ تقابلی مطالعہ کے لیئے یہ حواشی بڑے ہی کارآمد ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ اس ترجمہ کو ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جبل پور نے پھر شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

بلہور ضلع کان پور کے قاضی عابد علی صاحب (متوفی ۱۹۶۱ء) نے قرآن کا آسان ہندی زبان میں ایک ترجمہ کیا تھا جو قسط وار ماہنامہ اسلام کانپور میں شائع ہوتا رہا۔ اس کے پندرہ پارے چھپے تھے ۱۹۵۵ء میں جماعت اسلامی ہند نے قرآن کے پہلے پارے کا ہندی ترجمہ شائع کیا تھا جو پورا قرآن

---

[1] سید محمد علی، ارشاد رحمانی، مطبع فیض منبع شاہجہانی (بدون مقام و سنِ اشاعت) ص ۴۶۔

کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اصل ترجمہ اردو زبان میں مولانا صدرالدین اصلاحی نے کیا تھا۔ اسے ہندی میں منتقل کرنے کا فریضہ تین اشخاص نے انجام دیا، جس میں ایک غیر مسلم پنڈت کیلاش ناتھ برہسپت بھی شامل تھے۔

حافظ امام الدین رام نگری نے قرآن کے آخری پارے کا ہندی ترجمہ ۱۹۵۸ء میں شائع کیا تھا اس کے دو ایڈیشن نکلے۔ ایک متن کے ساتھ اور دوسرا متن کے بغیر۔

قرآن کا ایک ترجمہ ہندی میں نند کمار اودستھی نے لکھنؤ سے شائع کیا۔ انھوں نے قرآن کے متن کو بھی ہندی رسم الخط میں منتقل کر کے ترجمہ کے ساتھ رکھا۔ کچھ حواشی بھی لکھے۔

ہندی زبان کے مشہور و معروف شاعر و ادیب بھارتیندر دہرش چندر (भारतेन्दु हरिश्चन्द्र) (متوفی ۱۸۸۵ء) نے بھی قرآن کا ہندی ترجمہ کرنا شروع کیا تھا۔ یہ ترجمہ رسالہ ہرش چند چندر کا ۱۸۷۷ء کے جلد ۵، شمارہ ۱، ۲ سے شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ افسوس کہ یہ سلسلہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔[1]

راقم الحروف کو بھی خدا کے فضل سے قرآن کا ہندی ترجمہ کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ ترجمہ مدیر الحسنات، رام پور کی نگرانی میں کیا گیا تھا۔ اس ترجمہ کے سلسلہ میں مجھے بعض ہدایات کی پابندی کرنا پڑی۔ مثلاً اصطلاحی الفاظ کو ترجمہ میں جوں کا توں رکھا جائے۔ یعنی اللہ، آخرت، رسول، زکوٰۃ کے قسم کے الفاظ کا ترجمہ نہ کیا جائے۔ بلکہ یہی الفاظ ترجمہ میں استعمال کئے جائیں۔ البتہ کتاب کے آخر میں ان الفاظ کی تشریح کر دی گئی ہے۔ یہ ترجمہ حواشی کے ساتھ پہلی بار جنوری ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اور اب تک اس کے نو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

اوپر قرآن مجید کے جن ہندی تراجم کا ذکر میں نے کیا ہے ان میں سے چند کو چھوڑ کر سبھی تراجم میری نظر سے گزرے ہیں۔ یہ تراجم اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب رہے ہیں اس پر اظہارِ خیال کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فنِ ترجمہ اور ترجمہ کی دشواریوں اور بالخصوص قرآن کے ترجمہ کی مشکلات پر مختصراً کچھ عرض کر دوں۔

---

[1] دھرم یگ، ۱۵ فروری ۱۹۷۰ء۔

کسی کتاب کا بہترین ترجمہ وہی ہے جس میں نہ صرف یہ کہ اصل کتاب کا مضمون کسی کمی یا تبدیلی کے بغیر منتقل ہو بلکہ اس کے ساتھ اصل کتاب کی تاثیر بھی منتقل کی جاسکی ہو۔

کلام بنیادی طور پر دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جس کا مقصد صرف کچھ باتیں یا معلومات پڑھنے یا سننے والوں تک پہنچا دینا نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ ہی اس کا مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ سامعین یا قارئین کی روح کو بھی بیدار کیا جائے۔ ان کے اندر سوئے ہوئے جذبات کو جگایا جائے، انہیں ان کیفیات کی شیرینی یا تلخی سے آشنا کیا جائے، جن سے بالعموم لوگ ناآشنا نظر آتے ہیں، اس سے آگے بڑھ کر اس کے پیش نظر کسی قوم یا پوری انسانیت کے اندر انقلاب برپا کرنا بھی ہوسکتا ہے۔ اس طرح کے مقاصد کے حصول کے لیے ظاہر ہے کہ سپاٹ اور سادہ بیان کافی نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے جس قسم کا کلام درکار ہوتا ہے اُسے کلامِ موثر کہہ سکتے ہیں۔

کلام کی دوسری قسم وہ ہے جس کا مقصد صرف آپ کے لیے کچھ معلومات فراہم کرنی ہوتی ہے جیسے جغرافیہ یا فزکس کی کتاب میں آپ دیکھتے ہیں۔ اِس طرح کی کتابوں کا اندازِ بیان کلامِ مؤثر سے بالکل مختلف ہوگا اور ہونا بھی چاہیے۔ جغرافیہ کی کتاب میں شاعری یا خطبے کا انداز اختیار کرنا نہایت غلط اور مضحکہ خیز بات ہوگی۔

قرآن مجید کے بارے میں اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ اس کا کلام مؤثر ہے۔ وہ کوئی سپاٹ اور سادہ کتاب نہیں ہے۔ اس کے کلام میں جو وقار، زور، بہاؤ، شیرینی، نغمگی، ادب اور صوتی جمال پایا جاتا ہے وہ اپنی جگہ بے مثل ہے۔

ترجمہ بھی ایک تخلیقی کام ہے۔ ترجمہ اور تخلیق میں فرق کرنا صحیح نہیں۔ کامیاب ترجمہ وہی ہے جسے پڑھ کر محسوس نہ ہو کہ وہ ترجمہ ہے۔ نیز ہر زبان کا اپنا ایک مزاج اور لہجہ ہوتا ہے۔ ترجمہ میں اس کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ مثال کے طور پر IT IS GOING TO BE کا ترجمہ "یہ ہونے جارہا ہے" ترجمہ کی زبان کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا۔ صحیح ترجمہ یہ ہوگا: "یہ ہونے والا ہے"۔

ترجمہ میں ترجمہ کرنے والے کے جذبِ اندرون کی شمولیت ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر اس کام میں اصلیت و صداقت کا وصف پیدا نہیں ہوسکتا۔ ترجمہ محض نقل نہیں ہے۔ ترجمہ میں اصل کے سارے ہی امکانات کو کم و بیش سمیٹنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ یہ فریضہ کیوں کر ادا ہو؟ اس

لیے ضروری ہے کہ ترجمہ کرتے وقت اصل کا مفہوم و مدّعا ہی نہیں، بلکہ اس کی تیزی و تیکھاپن، اس کی نرمی و لطافت اور اس کی دلکشی و جاذبیت وغیرہ بھی پیشِ نظر ہو۔ اس میں جو زور، نرمی، دلکشی و سادگی پائی جاتی ہو اُسے بھی ترجمے میں اُتارنے کی کوشش کی جائے۔ ترجمے کا کام صرف ڈکشنری سے نہیں چل سکتا۔ ممکن ہے کہ ڈکشنری میں کسی لفظ کے دیئے ہوئے معنی سے کچھ اور وسیع مفہوم میں اس کا استعمال کیا گیا ہو۔ مثلاً کسی نے لکھا ہے: یہ آئین چھوٹی بڑی قوموں کے EQUILIBRIUM پر قائم ہے۔ مصنّف نے یہاں ایک خاص لفظ استعمال کیا ہے۔ لفظ کا انتخاب بے معنی نہیں ہے۔ لُغت میں اس کے معنی دیئے ہیں STATE OF BEING PERFECTLY BALANCED لیکن صاف ظاہر ہے کہ توازن اور غیر جانب داری (NEUTRALITY) کے ساتھ اس میں کوئی اور بات بھی شامل ہے۔ اب اگر ترجمہ میں یہی توازن یا غیر جانب دارانہ حالت وغیرہ رکھ دیا جائے تو مصنّف کا منشا ظاہر نہ ہو سکے گا۔ اس کی جگہ اگر آپ "ہم آہنگی" یا "جذب باہم" رکھتے ہیں تب کہیں جا کر مصنّف کے اصل مدعا کا اظہار ہو سکے گا۔

بعض اوقات اصل عبارت یا لفظ کے کئی معانی نکل رہے ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں سوچنا ہوگا کہ کیا اس میں کئی معنی پیدا کرنا مصنّف کا منشاء ہے؟ یعنی کیا اُسے ایک رنگ میں کئی ہلکے ہلکے رنگوں کی آمیزش مطلوب ہے؟ یا اس کے ذہن میں محض ایک ہی مفہوم ہے لیکن اس نے لفظ یا جملہ ایسا لکھ دیا ہے کہ جس سے کئی معنی کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ ترجمہ میں پیروی مصنّف کے منشا ہی کی کرنی ہوگی۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ لفظ اپنے اصل معنی سے دُور ہو کر ثانوی معنی میں استعمال ہونے لگتا ہے۔ اب اگر کوئی اصل معنی ہی کو ترجمہ میں رکھتا ہے تو یہ غلط ہوگا۔ کسی تقریر یا تحریر کا اصل مقصد خیالات کا ابلاغ ہے، لیکن اگر محض الفاظ کو دوسری زبان میں منتقل کر دینے سے مفہوم پوری طرح ادا نہیں ہوتا یا اس قوّت یا اثر کے ساتھ منتقل نہیں ہوتا جس قوت اور اثر کے ساتھ اصل تحریر یا تقریر میں اس مفہوم و خیال کا اظہار ہوا ہے تو ایسی حالت میں الفاظ اور ان کی تقدیم و تاخیر اور جملوں کی ساخت وغیرہ میں تبدیلی لا کر یہ مقصد پورا کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس کے بغیر ترجمہ کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اصل عبارت میں جملے کی کوئی ساخت فصیح ہو، لیکن ترجمہ کی زبان میں اسے اختیار کرنے سے فصاحت ختم ہو جاتی ہو۔ ایسی صورت میں اس سے پرہیز ضروری ہے۔

ترجمہ کے وقت اصل عبارت کے علاوہ اس کے بین السطور (BETWEEN THE LINES)

کو بھی پڑھنا چاہیے اور بین السطور (جو مفہوم ان الفاظ کے درمیان پوشیدہ ہوتا ہے، الفاظ میں ظاہر نہیں کیا گیا ہوتا) کی مدد سے اصل عبارت کا ترجمہ کرنا چاہیئے۔ ترجمہ میں جہاں تک ممکن ہو مصنف کا رنگ اور اس کا طرز اختیار کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اصل مصنف کے رنگ کو ترک کر کے اگر مترجم اپنا رنگ اختیار کرتا ہے تو ترجمے میں مصنف کے بجائے مترجم چھا جائے گا اور یہ ایک بہت بڑا عیب و نقص قرار پائے گا۔ ترجمہ تین قسم کے ممکن ہیں، ایک لفظی ترجمہ، دوسرا آزاد ترجمہ جس میں اصل مصنف کے صرف خیالات کی پیروی الفاظ سے بے نیاز ہو کر کی جاتی ہے۔ اور تیسرا ان دونوں کے درمیان۔ یہی تیسری قسم سب سے بہتر ہے۔ اسے تخلیقی (CREATIVE) ترجمہ کہہ سکتے ہیں۔ خیال اور مفہوم اپنے باریک سے باریک پیچ و خم کے ساتھ ادا ہو، ترجمہ کا کمال یہی ہے۔ اس کے لیئے مترجم کو اصل مصنف کی شخصیت میں اپنے کو گم کرنا پڑتا ہے۔ ترجمہ کرنے والا یہ ملحوظ رکھے کہ فلاں بات یا عبارت کو اگر ترجمہ کی زبان میں لکھنا ہوتا تو مصنف کس طرح لکھتا بس اسی کی پیروی کرنی چاہیئے۔ اس جہت سے اگر ترجمہ کامیاب ہے تو اسے کامیاب کہا جائے گا۔ اس کی ایک مثال یہ دی جاتی ہے۔ انگریزی کا ایک فقرہ ہے :-

I AM THE GOD WHO WAS BORN OF THE MIND OF THE CREATOR.

اس کا کامیاب ترجمہ یہ ہے : "میں وہ دیوتا ہوں جو کرتار کے من میں پیدا ہوا"۔

MIND کا ترجمہ ذہن، دماغ، دل بھی کیا جا سکتا تھا لیکن من ہی اس کا صحیح اور بہتر ترجمہ ہو سکتا تھا۔ اہلِ ذوق اس بات کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ اسی طرح (CREATOR) کا ترجمہ کرتار ہی موزوں تھا۔ مفہوم اور اثر کے لحاظ سے بھی اور صوتی اعتبار سے بھی۔

شاعری کے ترجمے کے بارے میں یہ بات مشہور و معروف ہے کہ اس کا ترجمہ کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ شاعری کے ترجمے میں سب سے پہلے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس کو پابند نظم میں منتقل کیا جائے یا اسے آزاد نظم کے قالب میں ڈھالا جائے۔ اس کے لیئے دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے بحروں کے انتخاب کا یہ مسئلہ کم اہم نہیں ہے۔ مختلف بحور کی مختلف تاثیر ہوتی ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ شاعری کے ترجمے میں یہ بھی سوچنا پڑتا ہے کہ اس کے ترجمے میں اصل متن سے وفاداری یعنی اس کی پیروی کس حد تک ضروری ہے۔ ترجمے میں تازگی نیز تخلیقی اثر باقی رکھنے کے لیئے اصل متن کی پروا بس ایک حد تک ضروری ہے ورنہ

یہ ترجمہ کوئی تخلیقی کارنامہ ثابت نہیں ہو سکتا اور نہ اس میں اصل کی تاثیر ہی باقی رہ سکتی ہے۔ کسی نظم کا ترجمہ دراصل قوت اور تخیلی صلاحیت صرف کر کے اسے از سرِ نو جنم دینا ہوتا ہے۔

قرآن مجید جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کوئی سپاٹ کلام نہیں ہے۔ کسی عظیم شاعری سے کہیں بڑھ کر اس کے اندر زور داثر اور نغمگی اور صوتی جمال پایا جاتا ہے لیکن بالعموم قرآن کے جو ترجمے ہوئے ہیں ان میں ان خصوصیات میں سے کوئی خصوصیت نہیں ملتی۔ ترجمے اکثر لفظی کیے گئے ہیں جس کی وجہ سے ترجمہ کی عبارت پھیکی ہو کر رہ گئی ہے۔ معاملہ چونکہ کلامِ الٰہی کا تھا اس لیے مترجمین ترجمے میں کسی آزادی کے روادار نہیں ہوئے[1]۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندی یا اردو زبان میں جس حد تک زور داثر لانا ممکن بھی تھا اس سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا۔

جہاں تک اسٹائل، اسلوب اور ادبی محاسن کا تعلق ہے اس سلسلے میں قرآن کا ترجمہ کرتے وقت یہ خیال رکھنا ضروری تھا کہ قرآن کے ترجمے کی زبان عام زبان سے ممتاز ہو۔ خود قرآن کی زبان اپنے زمانۂ نزول کی عربی سے ممتاز اور مختلف ہے۔ قرآن نثر اور نظم دونوں کی خصوصیات کا حامل ہے۔ نثر مقفیٰ میں ہم جانتے ہیں کہ اگر نثر کی ترتیب (PROSE ORDER) نہ بھی ہو تو کوئی حرج نہیں کیونکہ عبارت کا حُسن اور اس کی دلکشی اس بے ترتیبی کو محسوس نہیں ہونے دیتی۔ لیکن ترجمہ اگر سادہ ہے تو پھر نثر میں بے ترتیبی اور انتشار ناگوار ثابت ہوگا۔

اس کے علاوہ ہم اشارہ کر چکے ہیں مصنف کا رنگ و انداز اور اظہار جذبات کلام کی جان ہے۔ اس کا لحاظ ضروری ہے۔ مثال کے طور پر کسی شاہانہ کلام کو اگر سوقیانہ (بازاری) زبان میں منتقل کر دیا جائے تو یہ اس کا خون کرنا ہوگا۔ (باقی)

---

[1] یہ بھی تو ایک طرح کی آزادی ہے کہ الفاظ کی صفیں تو کھڑی کر دی جائیں مگر بیان اور ابلاغ کی جو خوبیاں مصنف کو مطلوب تھیں، غائب کر دی جائیں۔ (ف۔ ص)